قصبوں یا شہروں میں اپنا مرکز بنائے ہوئے ہیں جن کی آبادی، حالیہ عشروں میں دیہاتوں سے شہروں کی طرف آبادیوں کی منتقلی کے سبب، بے تحاشا بڑھ چکی ہے۔ آج پاکستان میں چودہ کروڑ لوگ بستے ہیں جن میں سے زیادہ تر غریب ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں انتہا پسند گروہوں کے ورغلانے میں آسانی سے آ سکتے ہیں، جو ان تمام مسائل کے حل کا دعویٰ کرتے ہیں جنہیں ان کی حکومتیں حل کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں یا جنہوں نے ان کے مسائل کو نظر انداز کیا ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں انتہا پسند گروپ ان علاقوں میں زیادہ مؤثر ہیں جہاں مقامی حکومتیں لوگوں کے ترقیاتی کام کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

بیرونی عناصر نے بھی جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں انتہا پسندی کو تقویت دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سٹرن نے افغانستان میں انتہا پسند گروہوں کے عروج میں امریکہ اور سعودی عرب کی طرف سے فنڈنگ کے کردار اور آئی ایس آئی کی طرف سے تکنیکی امداد کی طرف اشارہ کیا۔ عرب دنیا میں، مصلح کے مطابق، پڑھا لکھا طبقہ، متشدد عرب حکومتوں کی حمایت اور مدد کرنے پر امریکی حکومت کا سخت ناقد ہے۔

مذہبی انتہا پسندی کی چوتھی اور آخری وجہ خود اسلام کے اندر ایک گہرے بحران سے متعلق ہے۔ اب مذہبی علماء قرآن کی مسلسل ارتقاء پذیر تشریح کے بجائے مذہبی عقائد کی تعبیر بڑی تنگ نظری اور سخت گیری کے ساتھ کرتے ہیں۔ مسلمان معاشروں کو خود شناسی اور خود احتسابی کے ایک حقیقی عمل میں شامل ہو جانا چاہیے اور اس پیچیدہ سوال پر غور کرنا چاہیے کہ وہ آخر کیوں پائیدار مذہبی اور دیگر ادارے قائم کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں جو ان کے معاشروں کو بدلتی دنیا کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنے میں ان کی مدد کر سکیں۔

[جوڈی برسلوو امریکی ادارے United States Institute of Peace کے ڈائریکٹر ہیں۔]

بھارت کے دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم
کیا مسلمانوں میں قرون وسطیٰ کا مزاج برقرار رکھے ہوئے ہے؟

تحریر: ر- اپادھے*

ترجمہ: سیّد محمد علی بن عزیز

بھارتی حکومت کے ایک حالیہ اعلامیہ (سرکلر) پر، جس کا مقصد دینی مدارس کی ملک مخالف سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے، کافی اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔ لیکن اگر ہم مدارس کے ہندوستان میں قیام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلامی نظام تعلیم ہمیشہ اس ملک کے مسلمانوں میں علیحدگی کی تحریک کو زندہ رکھنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہے۔ انگریز بھی ان کے بارے میں شک وشبہ کا شکار رہے ہیں۔ بعد از نو آبادیات دور میں معلوم نہیں کن وجوہات سے مدارس کو آئینی خود مختاری کا خصوصی استحقاق دیا گیا، لیکن جس طور سے مدارس نے مسلمانوں میں قرون وسطیٰ کے دور کے مزاج کو سیکولر تعلیم کے مقابلے میں قائم رکھا ہے، اسے ضرور دیکھا جانا چاہیے۔ دراصل دقیانوسیت، مذہبی قدامت پرستی اور قرون وسطیٰ کی شناخت قائم رکھنے کا خبط ہندوستان کے مدارس کے نظام تعلیم کا بنیادی مقصد رہا ہے۔

مسلمان معاشرے کا خط حیات ہونے کے باعث مدرسہ ہندوستان میں دینی تعلیم کی حقیقی بنیاد ہے۔ لیکن موجودہ دور کی معاشی وسماجی ضروریات کے حقیقی ادراک کی غیر موجودگی کی وجہ سے مدراس کو چلانے والے اپنے نظام تعلیم کی مثبت تشکیل میں ناکام رہے ہیں اور اپنے سیاسی مقاصد کے لیے انہوں نے معاشرے کو قرون سطیٰ کی سوچ سے باہر نہیں نکلنے دیا ہے۔

''مدرسہ ایک تعلیمی ادارہ ہے جہاں اسلامی علوم، جن میں ادب اور فلسفہ شامل ہیں، پڑھائے جاتے ہیں'' [۱]۔ مدارس کی تعلیم کا قابل اعتراف مقصد اسلام کے ماننے والوں میں اسلامی عقائد و اعمال کو راسخ

* R. Upadhyay, "Madrasa Education in India - Is it to sustain medieval attitade among Muslims?" *South Asia Analysis Group*, //www.saag.org/papers8/paper730.html//

کرنا اور ان کو قرآن وسنت کی پیروی کرنے کے قابل بنانا ہے۔ چنانچہ دینی مدراس کی تعلیم بنیادی طور پر دو ستونوں قرآن اور سنت پر قائم ہے۔

مدارس کی تاریخ ۱۲۰۶ء میں سلطنت دہلی کے قیام کے زمانے کی ہے

ابتداً اس تعلیم کا مقصد لوگوں کو سرکاری ملازمت کے قابل بنانا ہوتا تھا[۲] اور اسی وجہ سے نصاب تعلیم مسلمان حکمرانوں کی انتظامی ضروریات کے مطابق تھا۔ رفتہ رفتہ ان حکمرانوں کی اعانت سے اسے شمالی ہندوستان تک پھیلا دیا گیا۔ چند مسلمان مفکرین کا یہ دعویٰ کہ مذہبی، عقلی اور سائنسی علوم بھی مدارس میں متعارف کرائے گئے تھے، ایک مفروضہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ ''سائنس کو مسلمانوں کے زمانہ عروج میں ترویج وترقی اس لیے حاصل ہوئی کیونکہ اس وقت خود اسلام ہی میں عقلیات کا رواج موجود تھا جو کہ ان مسلمان مفکرین کا پیدا کردہ تھا جو معتزلین کہلاتے تھے''۔ ''تاہم یہ رواج چودھویں صدی عیسوی میں اس وقت بالکل ختم ہو گیا جب مسلم دنیا کو قدامت پرستی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا''[۳]۔

ہندوستان میں مدرسے کا قیام اور کام مذہبی دائرہ کار ہی میں رہا۔ ہندوستانی مدارس کے نصاب میں اسلامی مضامین کا غلبہ شروع سے ہی قائم رہا۔ عربی اور فارسی طریقہ تعلیم کو برقرار رکھنے کی وجہ سے ہندوستانی مدارس نے ہمیشہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کے ظاہر و باطن کو قدامت پرستی کی جانب مائل رکھا۔ مدارس کے منتظمین نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کا نصاب تعلیم بدلتے ہوئے حالات سے کس قدر مطابقت رکھتا ہے۔ نصاب تعلیم میں مذہب پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے علوم عقلیہ کو اکثر نظر انداز کر دیا گیا۔ ان اداروں میں دی جانے والی مذہبی تعلیم نے تعصب کو جنم دیا جو کہ ہندوستانی معاشرے میں تناؤ کی ایک بڑی وجہ بن کر سامنے آیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان مدارس میں علوم عقلیہ کا بھی رواج رہا ہو، جیسا کہ بعض مسلم ماہرین تعلیم کا دعویٰ ہے، لیکن ہندوستان میں دینی مدارس تیزی سے بدلتی ہوئی معاشرتی اور تعلیمی فضا کے ساتھ چلنے میں ناکام رہے۔

مسلم حکومت کے خاتمے اور خصوصاً انگریز کے دور حکومت کے آغاز کے بعد مدارس کی تعلیم نے رفتہ رفتہ اپنی وہ چمک دمک کھو دی جو اسے مسلمانوں کے دور حکومت میں حاصل تھی۔ اسے ایک بڑا دھچکہ لگا اور

جدید نظام تعلیم کے آغاز نے اسے مزید پیچھے دھکیل دیا۔ مدارس کے اساتذہ نے اسی وجہ سے سخت گیری کا رویہ اپنایا اور مسلمانوں کے لیے فقط دینی تعلیم ہی کی ضرورت پر زور دیا۔ مدارس کے راہنماؤں کی انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں تاریخی شرکت سے ثابت ہو گیا کہ روایتی اسلامی تعلیم کا بڑا مقصد مسلمانوں میں سیاسی طاقت از سر نو حاصل کرنے کے جذبات کی افزائش تھا۔ بغاوت میں علماء کے اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے انگریز حکمرانوں نے مدارس کو انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے والے اداروں کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی کی ناکامی کے بعد مسلمان علماء اس خوف میں مبتلا ہو گئے کہ انگریزوں کے مغربی طریقہ تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کا مذہبی طرز زندگی مغربیت سے آلودہ ہو جائے گا۔ ان کی فوری ضرورت مسلم معاشرے کو مغربی طرز تعلیم کی طرف رخ کرنے سے بچانا اور عربی - فارسی طرز تعلیم کو آگے لانا تھی جو کہ فقط مدارس ہی کے ذریعے پوری ہو سکتی تھی۔ انہوں نے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم (دیوبند) نامی ایک دینی ادارے کے قیام سے مدارس کی تحریک شروع کی تاکہ مسلمانوں کو اسلامی نظام تعلیم کے تحت تعلیم دی جا سکے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر فرنگی محل (لکھنؤ)، دارالعلوم (دیوبند) اور ندوۃ العلماء (لکھنؤ) جیسے ادارے مسلمانوں کی علیحدگی کی تحریک کی پرجوش علامات کے طور پر سامنے آئے۔

تحریک دیوبند کے برعکس سرسید احمد خان نے جو انگریزوں کے وفادار تھے، علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی اور ۱۸۷۳ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم ہوا تاکہ مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج ممکن ہو۔ بعد ازاں یہ ادارہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ زیادہ حقیقت پسند ہونے کے باعث انہوں نے مسلم معاشرے کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سید احمد خان نے دینی مدارس کے نصاب تعلیم کو اس دور اور وقت کی ضرورت کے لیے فرسودہ تصور کیا۔ انہوں نے اس نصاب پر اعتراض کیا کہ اس میں نصاب کی اصل روح کو سمجھنے کے مقابلے میں یاد کر لینے پر زور دیا جاتا ہے۔

ایک مفکر فضل الرحمٰن نے کہا: ''تمام اقسام علم کو عضویاتی اعتبار سے اکٹھا کر کے اس کا رخ کٹر مذہبیت کی جانب موڑ دینے سے اختراعی علمی صلاحیت اور فطری سوچ مسخ ہو گئی''[۴]۔ اگرچہ دونوں ادارے

ایک دوسرے کی مکمل ضد تھے، لیکن ان دونوں کا مقصد مسلمانوں کی علیحدگی کی تحریک کو زندہ رکھنا تھا۔

سرسید احمد خان نے ۱۸۸۶ء میں اپنی تعلیمی حکمت عملی کو تمام ہندوستانی مسلمانوں میں عام کرنے کے لیے "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کی داغ بیل ڈالی۔ یہ دراصل علی گڑھ تحریک کا ایک حصہ تھی۔ اس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایسی تعلیمی پالیسی وضع کرنا تھا جس کے ذریعے انہیں اس وقت کے مغربی تعلیم کے دھارے میں لایا جا سکے۔ آج بھی یہ تحریک سرکاری سکولوں میں ہندو تعصب پر مبنی تعلیم دینے کا الزام لگا کر [مسلمان] کمیونٹی کو ہراساں کر رہی ہے۔ معاشرتی سطح پر الگ تھلگ رہنے کے اس رجحان نے مسلمانوں میں قومیت کا شعور بیدار کرنے میں مہمیز کا کام دیا اور برصغیر پاک و ہند میں ہندو مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ بعدازاں اسی سے دوقومی نظریہ نے جنم لیا۔ "اگرچہ ہندوستان کی تقسیم میں اس کا بظاہر کوئی کردار نظر نہیں آتا اور یہ ایک بحث طلب امر ہے، تاہم تقسیم ہند میں اس کا کردار مسلم لیگ سے کسی طور پر بھی کم نہیں"۔[۵] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید جیسے مصلح کے یہاں ایسے ہندوستان کا، کہ جہاں ہندو اور مسلمان مشترکہ تعلیم حاصل کر سکیں، کوئی تصور نہیں تھا۔

بعدازاں دیوبند اور علی گڑھ سے متاثر ہو کر ندوۃ العلماء اور جامعہ ملّیہ جیسے دیگر اسلامی اداروں کی علی الترتیب لکھنؤ اور دہلی میں بنیاد رکھی گئی۔ ندوۃ نے علوم عقلیہ اور روزمرہ انگریزی تعلیم اپنے نصاب میں شامل کی لیکن اس کے عربی ادب اور اسلامی تاریخ پر حد سے زیادہ زور دینے کے باعث یہاں کے فارغ التحصیل لوگوں کی ملازمتوں کے لیے مانگ نہ بن سکی۔ جامعہ ملّیہ نے اپنے نصاب تعلیم میں دیوبند اور علی گڑھ کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی مگر اس کا مذہبی کردار اور اردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے پر اصرار اس کی جدید تعلیمی ادارے کی حیثیت سے پہچان بننے میں رکاوٹ بنا رہا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے اذہان میں قرون وسطیٰ کا طرز فکر راسخ ہونے کی وجہ سے یہ اسلامی ادارے بھی اپنے طلبہ کی ایسی ذہن سازی میں ناکام رہے جس سے وہ تنقیدی تناظر میں آزادی سے سوچ سکیں اور جدید تقاضوں کے مطابق زندگی کا لائحہ عمل تشکیل دے سکیں۔ اسی طرح ندوۃ بھی ایسا ہی قدامت پسند رہا جیسا کہ دیوبند تھا۔ جامعہ نے البتہ خاصی حد تک جدید تعلیم کو قبول کیا لیکن اس کا اردو کو ذریعہ تعلیم بنائے رہنے پر اصرار اس کے طلبہ کو ملازمت کے مواقع کے اعتبار سے دیگر جدید اداروں کے طلبہ کے برابر نہ لا

سکا۔

اگرچہ مسلم مفکرین کی ایک قلیل تعداد نے مغربی تعلیم کے مثبت ردِعمل کے طور پر سرسید کی علی گڑھ تحریک کی حمایت کی تاہم مسلم عوام کی واضح اکثریت نے دیوبند کی تحریک کی حمایت کی جو اسلامی تعلیم کی حامی تھی۔ انہوں نے علی گڑھ تحریک کی شدید مخالفت کی جو جدید اور سائنسی تعلیم کو متعارف کرانا چاہتی تھی۔

تبلیغ اسلام کے بنیادی مقصد کی خاطر ہندوستان میں مدارس نے عربی و فارسی اقدار کا ایک سماجی و سیاسی لائحہ عمل مرتب کیا تاکہ مسلمانوں کو جدید اور سائنسی دنیا سے الگ رکھا جاسکے۔ حتیٰ کہ موجودہ دور کے حقیقت پسند مسلمان مفکرین بھی جو کہ اسلامی جدیدیت کی بات کرتے ہیں، اپنے قرون وسطیٰ کے علمی محکومیت کے طرز فکر پر بمشکل قابو پا سکے ہیں۔ انہوں نے درحقیقت اس حقیقی مسئلے کو نظر انداز کر دیا ہے کہ مدارس کی تعلیم آج کے دور کی ملکی ترقی میں کس حد تک کارآمد ہے؟ جہاں تک طلبہ میں قرون وسطیٰ کے طرز فکر کا تعلق ہے دراصل مدارس کی تعلیم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں کی جدید تعلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چنانچہ مدارس کی تعلیم جو فی الواقع تبلیغ اسلام کے لیے ہے، ہمیشہ جدید مسلم تعلیمی اداروں کے لیے متاثر کن رہی ہے۔

ہندوستانی مسلمان مدارس کی تعلیم اور اس کی عربی و فارسی طرز سے ہمیشہ متاثر رہے ہیں اور نتیجتاً ان کے لیے اس بات کا اقرار مشکل ہے کہ مفید اور صحیح معلومات عربی اور فارسی زبانوں کے سوا کسی اور زبان میں بھی موجود ہوسکتی ہیں۔ وہ کسی ایسے علم کا تصور نہیں کر سکتے جو کہ اسلامی کتب میں موجود نہ ہو۔ عربی و فارسی نظام تعلیم کو ایک تاریخی ورثہ کے طور پر قائم رکھتے ہوئے اور اسے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک اثاثہ سمجھتے ہوئے ہندوستانی مدارس نے دوقومی نظریے کے پرچار میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تقسیم ہند نے آزاد ہندوستان کے مدارس پر ایک بدنما داغ لگا دیا ہے اس لیے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی واضح اکثریت دوقومی نظریے کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے حق میں تھی۔

تقسیم کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں کی کثیر تعداد پاکستان ہجرت کر گئی۔ لیکن وہ مسلمان جو ہندوستان میں رہے، مسلمانوں کی علیحدگی کی تحریک میں اپنی شرکت کی بناء پر مایوسی کا شکار ہو گئے۔ ہندو اکثریت والے آزاد خیال اور جمہوری ہندوستانی سیاسی معاشرے میں مدارس کا مستقبل ان کے لیے ایک بنیادی

اہمیت کا سوال بن گیا۔ نو آبادیاتی دور کے بعد ہندوستان میں ان کے راہنماؤں نے انہیں ہندو تعصب پر مبنی تعلیم کا ایک غلط تاثر دیا تھا۔ قومی تعمیر نو کے پروگراموں میں ہندوؤں کے شانہ بشانہ چلنے کی بجائے ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی جداگانہ شناخت کے مسئلے کو بنیادی اہمیت دی اور آئین میں دی گئی اپنی مساوی حیثیت سے فائدہ اٹھانے میں یکسر ناکام رہے۔

ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی غضب کی لہر سے بالاتر ہو کر ہندوستانی حکومت نے مسلمانوں کو آئینی تحفظ دیا کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کر لیں۔ اس کے باوجود ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان اپنی ثقافتی شناخت کو خطرے میں محسوس کرتے رہے۔

ہندوستانی آئین کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جو اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی خصوصی اجازت دیتا ہے، مدارس کے قیام میں یکا یک تیزی آئی۔ اسی سلسلے میں مدارس کے راہنماؤں کی مدد سے ایک کانگرسی لیڈر قاضی محمد عبدلعباسی نے اتر پردیش میں ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل اس خیال کے تحت کی کہ اسلام کے بنیادی اصول ہر مسلمان بچے کو ذہن نشین کرانے کے لیے مکتب (پرائمری سکول) بنائے جائیں۔ کونسل کا قیام اس لیے عمل میں آیا تھا کہ ''سرکاری سکولوں میں دی جانے والی مفروضہ ہندوانہ تعلیم کا مقابلہ کیا جا سکے''[۶]۔ عباسی نے ۱۹۶۰ء میں بنارس میں دینی کونسل سے خطاب میں کہا:

''میرے خیال میں ہمیں دینی کونسل کے لیے حکومت سے کسی قسم کی مدد طلب نہیں کرنی چاہیے اور خود کو سرکاری تعلیمی ادارے سے بھی منسلک نہیں کرنا چاہیے''[۷]۔ سرکاری سکولوں کی طرف مسلمانوں کا رجحان اس لیے کم تھا کہ ان کے خیال میں ان سکولوں میں دی جانے والی تعلیم اسلامی روایات کے منافی تھی۔

مدارس کے منتظمین نے اسلامی رواج و ثقافت پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے ان مدارس کے فارغ التحصیل افراد کے لیے ملازمت حاصل کرنے کے امکان کو کبھی ذہن میں نہ رکھا۔ حتیٰ کہ دیوبند اور ندوۃ جیسے اسلامی اداروں نے بھی، جنہوں نے حکمت عملی کے تحت تقسیم کی مخالفت کی تھی، کوئی خاص تبدیلی اپنے نصاب میں پیدا نہیں کی اور آزادئ ہند کے بعد بھی وہی طرز تعلیم برقرار رکھا۔ انہوں نے ہزاروں فارغ التحصیل افراد پیدا کیے اور چند برسوں میں بہت سے مدارس بھی قائم کیے لیکن اپنے یہاں سے فارغ ہونے والوں کی مادی ضروریات کے حصول کے لیے کچھ نہ سوچا۔ یہ لوگ ہندوستانی مسلمانوں کی مادی مشکلات

اوران کی معاشی، سماجی اور تعلیمی پسماندگی کے برابر کے ذمہ دار ہیں، جیسا کہ ہمیں آج نظر آ رہا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں تشکیل پانے والے سیکولر تعلیمی نظام کے برعکس مدارس کو اس طرح سے پروان چڑھایا گیا کہ وہ مسلمانوں کے لیے تعلیم کے افادی تصور سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ تعلیم کے اس افادی تصور کا بنیادی مقصد ہندوستانی معاشرے کی مادی ترقی ہے۔ مدارس نے ہندوستانی مسلمانوں میں خالص اسلامی ماحول ہی میں تعلیم حاصل کرنے کی سوچ کو پختہ کیا اور انہیں سرکاری سکولوں سے دور رکھا۔ اسی طرح مکتب اور مدرسے کی ملک کے مختلف علاقوں میں نشوونما نے ایک الگ مسلم شناخت برقرار رکھنے کی تحریک کے لیے مرکز کا کردار ادا کیا۔

''آج ملک بھر میں لاکھوں مدارس پھیلے ہوئے ہیں''۸۔ ''جو بہرحال ہندوستانی مسلمانوں کو ایک مثبت وضع اختیار کرنے میں مدد نہیں دے سکے ہیں''۔ اگرچہ مسلم اشرافیہ کا ایک حصہ جدید تعلیم کے میدان میں داخل ہوا لیکن یہ لوگ عام مسلمانوں کو متاثر نہیں کر سکے جو کمیونٹی میں بنیاد پرستوں کے رسوخ میں رہے۔ مسلمان تاہنوز تعلیم کی اس اسلامی تشریح کے زیر اثر ہیں جو کہ قدامت پرست مسلمان کرتے ہیں۔ ''مسلمانوں کی تعلیم کا حقیقی مقصد اس امر کے ادراک میں ہے کہ انفرادی، سماجی اور انسانی سطح پر مکمل طور پر اللہ ہی کی بات مانی جائے''۹۔

ہندوستان میں مسلمان حکومت کے خاتمے کے بعد انگریز کے متعارف کردہ مغربی نظام تعلیم پر مسلمانوں کا ردِعمل اس لیے قابل فہم ہے کہ وہ سیاسی طاقت سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن اگر آزادی ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان اپنی رضامندی سے روایتی اسلامی نظام تعلیم ہی کے قائل رہے تو وہ اپنی قیادت کے سوا کسی کو اپنی تعلیمی پسماندگی کا الزام نہیں دے سکتے۔ اگر وہ اب بھی بنیاد پرست اسلامی راہنماؤں کے زیر اثر رہنا چاہتے ہیں تو کوئی بھی تعلیمی اور معاشی سطح پر ان کے تیزی سے زوال کو روک نہیں سکتا۔

حاصل کلام

دینی مدارس کے نظام تعلیم کا مسلمانانِ ہند کو تعلیمی اور سماجی سطح پر پسماندہ رکھنا اگرچہ ایک بحث طلب

معاملہ ہے لیکن یہ ایک زمینی حقیقت ہے کہ اسلامی بنیاد پر دی جانے والی تعلیم موجودہ دور کی ملازمت کی منڈی کی ضروریات پورا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جدید علوم کے حصول کے بغیر مدارس دینیہ سے فارغ ہونے والے افراد نہ تو اپنی معاشی/ مادی حالت بہتر بنا سکتے ہیں نہ ہی وہ مسلمان معاشرے کو جدید دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی قیادت فراہم کر سکتے ہیں۔ ان کی ملازمتوں کا دائرہ کار مساجد اور دینی مدارس تک ہی محدود ہے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ اسلامی تعلیم کے لیے بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے شعبہ دینیہ کے علاوہ مدارس کی جاری کردہ اسناد کو ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیاں تسلیم نہیں کرتیں۔ بعینہ یہ اسناد انتظامی ملازمتوں کی اہلیت کے لیے بھارت سرکار بھی تسلیم نہیں کرتی۔ چونکہ یہ اسناد ملازمت کی منڈی کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہیں اس لیے ان کی کوئی عملی اہمیت نہیں ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی مادی حالت کے بارے میں کسی فکر مندی کے بغیر مدارس فقط اسلامی بنیاد پرست ہی پیدا کر رہے ہیں تا کہ یہ لوگ اسلام کے وفادار رہیں اور مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کے لیے مفید ثابت ہوں۔ دنیاوی تعلیم کے مقابلے میں اسلامی تعلیم پر زور دینا ملکی مفاد کے لیے سم قاتل ہے۔

سیاسی، ثقافتی، معاشی اور سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں مدارس کے نظام میں قرار واقعی تبدیلی کا تقاضا کرتی ہیں تا کہ ہندوستانی مسلمان معاشرے کی تبدیل ہوتی ضروریات کا ساتھ دے سکیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے اس احساس میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے کہ سرکاری اور نجی سکولوں میں ہندو ثقافت سے پُر تعلیم دی جاتی ہے، تا کہ مسلمان والدین اپنے بچوں کو ان اداروں میں کسی تردّد کے بغیر بھیج سکیں۔ لیکن مسلمان قائدین اور مفکر، چند ایک استثنا کے ساتھ، اپنے سماج کے سیاسی مسائل میں اس درجہ جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کا جدید تعلیم سے دوری کا مسئلہ ان کے نزدیک کوئی معانی ہی نہیں رکھتا اور یہی اصل مسئلہ ہے۔

مسلمان مفکرین کا ایک طبقہ دینی مدارس کی جدید خطوط پر تشکیل کرنے اور انہیں عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے حق میں ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی بنیاد پرست مسلمانوں کے اس خیال کی مشکل سے مخالفت کر سکتے ہیں کہ ''دینی مدارس کو انگریزی یا جدید اداروں میں بدلنے کے بجائے جدید تعلیمی اداروں کو اسلامی طرز پر لایا جائے''۔[۱۰]

عہد حاضر کے ثقافتی اور سماجی ماحول کے عقلی ادراک کے بغیر اسلامی صحیفوں کو فقط یاد کر لینا تعلیم کے حقیقی مقاصد کو پورا نہیں کرتا۔ اپنے معاشرے کی معاشی پسماندگی کا احساس رکھنے والے مسلمان ممکن ہے کہ اپنے لوگوں کو مدارس کے نصاب کی قید سے آزاد کرانا چاہتے ہوں لیکن مسلم معاشرے میں بنیاد پرست قوتوں کا مضبوط اثر اس راہ میں حقیقی رکاوٹ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستانی مدارس نے متعدد عالمی شہرت یافتہ مسلمان علماء پیدا کیے ہیں لیکن ان مدارس سے فارغ ہونے والے لاکھوں مسلمان ملازمت کے مواقع سے محروم ہیں کیونکہ انہوں نے جدید تعلیم کو یکسر نظرانداز کر دیا ہے۔

مدارس کے منتظمین کے اپنے دینی نصاب کے حق میں اپنے دلائل ہوں گے لیکن جہاں تک معاشی ترقی کا سوال ہے، مسلمانوں کو عہد حاضر کے حقائق سے دور رکھنا ان کے لیے شدید نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ مدارس کا نصاب مذہب کے عمرانی پہلو کو مکمل طور پر نظرانداز کرتا ہے اور اس بنیاد پر کہ اسلام ہر زمانے کے لیے ایک جامع، مکمل اور درست ضابطہ حیات ہے فکری آزادی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہندوستان میں عہد حاضر کے سماجی ماحول کے غیر واضح ادراک کے باعث مدارس کا نصاب تعلیم مسلم معاشرے کے رویے کو آزاد خیال بنانے میں ناکام رہا ہے۔

بنیادی طور پر دینی مدارس کے نظام کا مقصد مسلمانوں کو اسلامی طرز زندگی سے آشنا کرنا اور علم کی تمام شاخوں کو اسلامی طرز پر استوار کرنا (Islamization of Knowledge) تھا لیکن موجودہ دنیا اسے تعلیم کے واحد مقصد کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتی۔ دینی تعلیم کو، جو کہ ایک قطعی مختلف مضمون ہے، عہد حاضر کی ضروریات سے عہدہ برا کرنے کے قابل بنانے والی تعلیم سے جدا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ان کی قدامت پرست دینی سوچ اور اپنی ثقافتی پہچان کو کھو دینے کا خوف انہیں تنہا کیے دے رہا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی ایک قومی مسئلہ ہے۔ لیکن جب تک وہ اس کے حل کے لیے تیار نہیں ہوتے، اسے حل کرنا مشکل ہے۔ اگر وہ اپنے مدارس کو جدید تعلیمی اداروں میں تبدیل کرنے کے لیے تیار ہوں، جہاں اسلامی علوم اختیاری مضامین کی حیثیت سے پڑھائے جائیں، تو ملک کو ان کی مدد کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔